نام

پہلے ہی لفظ عبس کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول

مفسرین و محدثین نے بالاتفاق اس سورت کا سبب نزول یہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں مکہ معظمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضور ان کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔ اتنے میں ابن ام مکتوم نامی ایک نابینا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضورؐ کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپ نے ان سے بے رخی برتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل ہوئی۔ اس تاریخی واقعہ سے اس سورت کا زمانہ نزول بآسانی متعین ہوجاتا ہے۔

اولاً یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم بالکل ابتدائی دور کے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ حافظ ابن حجر اور حافظ ابن کثیر تصریح کرتے ہیں کہ اسلم بمکۃ قدیماً اور ھو ممن اسلم قدیماً یعنی یہ ان لوگوں میں سے تھے جو مکہ معظمہ میں بہت پہلے اسلام لائے تھے۔

ثانیاً حدیث کی جن روایات میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے ان میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ اسلام لا چکے تھے اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف مائل ہوچکے تھے اور تلاش حق میں حضور کے پاس آئے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے آکر عرض کیا تھا : یا رسول اللہ، ارشدنی (یا رسول اللہ، مجھے سیدھا راستہ بتائیے)۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ آکر قرآن کی ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے اور حضور سے عرض کیا یا رسول اللہ علمنی مما علمک اللہ " یا رسول اللہ، مجھے وہ علم سکھائیے جو اللہ نے آپ کو سکھایا ہے"۔ ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور کو خدا کا رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کرچکے تھے۔ دوسری طرف ابن زید آیت 3 کے لفظ لعلہ یزکی کا مطلب لعلہ یسلم (شاید وہ اسلام قبول کرلے) بیان کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنا یہ ارشاد بھی کہ " تمہیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو ؟ " اور یہ کہ " جو خود دوڑا آتا ہے تمہارے پاس اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رخی برتتے ہو " اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس وقت ان کے اندر طلب حق کا گہرا جذبہ پیدا ہوچکا تھا، وہ حضورؐ ہی کو ہدایت کا منبع سمجھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے کہ ان کی طلب یہیں سے پوری ہوگی، اور یہ بات ان کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی کہ انہیں ہدایت دی جائے تو وہ اس سے مستفید ہوں گے۔

ثالثاً حضورؐ کی مجلس میں جو لوگ اس وقت بیٹھے تھے، مختلف روایات میں ان کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اس فہرست میں ہمیں عتبہ، شیبہ، ابو جہل، امیہ بن خلف، ابی بن خلف جیسے بد ترین دشمنان اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کشمکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپ کے ہاں ان کی آمدورفت اور آپ کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہوگیا ہو۔ یہ سب امور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سورت بہت ابتدائی زمانے کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون

بظاہر کلام کے آغاز کا انداز بیاں دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بےرخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اس سورت میں نبی ﷺ پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پوری سورت پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفار قریش کے ان سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بےنیازی کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضورؐ کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اس طریقے کی غلطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپ اختیار فرما رہے تھے۔ آپ کا ایک نابینا سے بےرخی برتنا اور سرداران قریش کی طرف توجہ کرنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ آپ بڑے لوگوں کو معزز اور بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ یہ کوئی کج خلقی آپؐ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی، بلکہ معاملے کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے با اثر لوگ اس کی دعوت قبول کرلیں تاکہ کام آسان ہوجائے، ورنہ عام بےاثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرز عمل ابتدا میں رسول اللہ ﷺ نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوت حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس دعوت کے نقطہ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالب حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بےاثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بےنیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبول حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپ اسے ان مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ ان کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو ان کی ضرورت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾

ترش رو ہوا اور بے رخی برتی

اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾

اِس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آ گیا (۱)

(۱) ۔ اس پہلے فقرے کا انداز بیان عجیب لطف اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگرچہ بعد کے فقروں میں براہ راست رسول اللہ ﷺ کو خطاب فرمایا گیا ہے جس سے یہ بات خود ظاہر ہوجاتی ہے کہ ترش روئی اور بےرخی برتنے کا یہ فعل حضورﷺ ہی سے صادر ہوا تھا لیکن کلام کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے کہ گویا حضورﷺ نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے جس سے اس فعل کا صدور ہوا ہے۔ اس طرز بیان سے ایک نہایت لطیف طریقہ پر رسول اللہ ﷺ کو احساس دلایا گیا ہے کہ یہ ایسا کام تھا جو آپ کے کرنے کا نہ تھا۔ آپ کے اخلاق عالیہ کو جاننے والا اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ یہ آپ نہیں ہیں بلکہ کوئی اور ہے جو اس رویے کا مرتکب ہو رہا ہے۔

جن نابینا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد، جیسا کہ ہم دیباچہ میں بیان کر آئے ہیں، مشہور صحابی حضرت ابن ام مکتوم ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اور حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں بیان کیا ہے کہ یہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، ان کی ماں ام مکتوب اور حضرت خدیجہ کے والد خویلد آپس میں بہن بھائی تھے۔ حضورﷺ کے ساتھ ان کا یہ رشتہ معلوم ہوجانے کے بعد اس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ نے ان کو غریب یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر ان سے بےرخی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضور کے اپنے برادر نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گرے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپ نے ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا، لفظ اعمی (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضور کی بےاعتنائی کے سبب کی حیثیت سے خود بیان فرما دیا ہے۔ یعنی حضورﷺ کا یہ خیال تھا کہ میں اس وقت جن لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں ان میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پالے تو اسلام کو تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے، بخلاف اس کے ابن مکتوب ایک نابینا آدمی ہیں، اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر ان سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہوسکتا ہے، اس لیے ان کو اس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں اسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کرسکتے ہیں۔

وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾

تمہیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے

اَو یَذَّکَّرُ فَتَنفَعَہُ الذِّکۡرٰی ؕ ۴۝
یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟

اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۵۝
جو شخص بے پروائی برتتا ہے

فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ؕ ۶۝
اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو

وَ مَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ ۷۝
حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟

وَ اَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی ۸۝
اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے

وَ ہُوَ یَخۡشٰی ۹۝
اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے

فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی ۱۰۝
اس سے تم بے رخی برتتے ہو (۲)

(۲) ۔ یہی ہے وہ اصل نکتہ جسے رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کردیا تھا، اور اسی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابن ام مکتوم کے ساتھ آپ کے طرز عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپ کو بتایا کہ داعی حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتارہی ہے کہ وہ طالب حق ہے، اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہوجائے، اس لیے وہ راہ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کا رویہ صریحا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اسے راہ راست بتائی جائے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہوسکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اس متاع گراں مایہ کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی، خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، لولا ہو، فقیر بے نوا ہو، بظاہر دین کی طرف اسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اس دعوت کا اصل مقصد بندگان خدا کی

اصلاح ہے، اور اس شخص کا حال یہ بتارہا ہے کہ اسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کرلے گا۔ رہا دوسری قسم کا آدمی، تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی با اثر ہو، اس کے پیچھے پڑنے کی داعی حق کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی روش علانیہ یہ بتارہی ہے کہ وہ سدھرنا نہیں چاہتا، اس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے وہ اگر نہ سدھرنا چاہے تو نہ سدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعی حق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذۡكِرَةٌ ۱۱
ہرگز نہیں [۳] ، یہ تو ایک نصیحت ہے۔

(۳) ۔ یعنی ایسا ہرگز نہ کرو جو خدا کو بھولے ہوئے ہیں اور اپنی دنیوی وجاہت پر پھولے ہوئے لوگوں کو بےجا اہمیت نہ دو، نہ اسلام کی تعلیم ایسی چیز ہے کہ جو اس سے منہ موڑے اس کے سامنے اسے بالحاح پیش کیا جائے، اور نہ تمہاری یہ شان ہے کہ ان مغرور لوگوں کو اسلام کی طرف لانے کے لیے کسی ایسے انداز سے کوشش کرو جس سے یہ اس غلط فہمی میں پڑجائیں کہ تمہاری کوئی غرض ان سے اٹکی ہوئی ہے، یہ مان لیں گے تو تمہاری دعوت فروغ پا سکے گی ورنہ ناکام ہوجائے گی۔ حق ان سے اتنا ہی بےنیاز ہے جتنے یہ حق سے بےنیاز ہیں۔

(۴) ۔ مراد ہے قرآن۔

فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۱۲
جس کا جی چاہے اِسے قبول کرے۔

فِیۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۱۳
یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں

مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۱۴
بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں [۵]

(۵) ۔ یعنی ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہیں، ان میں خالص حق کی تعلیم پیش کی گئی ہے۔ کسی نوعیت کے باطل اور فاسد افکار و نظریات ان میں راہ نہیں پا سکے ہیں جن گندگیوں سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ کردی گئی ہیں ان کا کوئی ادنی سا شائبہ بھی ان کے اندر داخل نہیں ہوسکا ہے۔ انسانی تخیلات ہوں، یا شیطانی وساوس، ان سب سے یہ پاک رکھے گئے ہیں۔

بِاَیۡدِیۡ سَفَرَةٍ ۱۵
معزز اور نیک کاتبوں کے [٦]

(٦) ۔ ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو قرآن کے ان صحیفوں کو اللہ تعالیٰ کی براہ راست ہدایت کے مطابق لکھ رہے ہیں، ان کی حفاظت کر رہے تھے، اور رسول اللہ ﷺ تک انہیں جوں کا توں پہنچا رہے تھے ان کی تعریف میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک کرام، یعنی معزز۔ دوسرے بار، یعنی نیک۔ پہلا لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اتنے ذی عزت ہیں کہ جو امانت ان کے سپرد کی گئی ہے اس میں ذرہ برابر خیانت کا صدور بھی ان جیسی بلند پایہ ہستیوں سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور دوسرا لفظ یہ بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ان صحیفوں کو لکھنے، ان کی حفاظت کرنے اور رسول تک ان کو پہنچانے کی جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے اس کا حق وہ پوری دیانت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۱۶۝

ہاتھوں میں رہتے ہیں [۷]

(۷) ۔ جس سلسلہ بیان میں یہ آیات ارشاد ہوئی ہیں ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ قرآن مجید کی یہ تعریف محض اس کی عظمت بیان کرنے کے لیے نہیں کی گئی ہے بلکہ اصل مقصود ان تمام متکبر لوگوں کو، جو حقارت کے ساتھ اس کی دعوت سے منہ موڑ رہے ہیں، صاف صاف بتادینا ہے کہ یہ عظیم الشان کتاب اس سے بدرجہا بلندو برتر ہے کہ تمہاری حضوری میں اسے پیش کیا جائے اور تم سے یہ چاہا جائے کہ تم اسے شرف قبولیت عطا کرو۔ یہ تمہاری محتاج نہیں ہے بلکہ تم اس کے محتاج ہو۔ اپنی بھلائی چاہتے ہو تو جو خناس تمہارے دماغ میں بھرا ہوا ہے اسے نکال کر سیدھی طرح اس کی دعوت کے آگے سر تسلیم خم کردو۔ ورنہ جس قدر تم اس سے بےنیاز بنتے ہو اس سے بہت زیادہ یہ تم سے بےنیاز ہے۔ تمہاری تحقیر سے اس کی عظمت میں ذرہ برابر فرق نہ آئے گا، البتہ تمہاری بڑائی کا سارا گھمنڈ خاک میں ملا کر رکھ دیا جائے گا۔

قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَكۡفَرَهٗ ۱۷۝

لعنت [۸] ہو انسان [۹] پر، کیسا سخت منکر حق ہے یہ [۱۰]

(۸) ۔ یہاں سے عتاب کا رخ براہ راست ان کفار کی طرف پھرتا ہے جو حق سے بےنیازی برت رہے تھے۔ اس سے پہلے آغاز سورة سے آیت 16 تک خطاب نبی ﷺ سے تھا اور عتاب در پردہ کفار پر فرمایا جا رہا تھا۔ اس کا انداز بیان یہ تھا کہ اے نبی، ایک طالب حق کو چھوڑ کر آپ یہ کن لوگوں پر اپنی توجہ صرف کر رہے ہیں جو دعوت حق کے نقطہ نظر سے بالکل بےقدر و قیمت ہیں اور جن کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ جیسا عظیم القدر پیغمبر قرآن جیسی بلند مرتبہ چیز کو ان کے آگے پیش کرے۔

(۹) ۔ قرآن مجید میں ایسے تمام مقامات پر انسان سے مراد نوع انسانی کا ہر فرد نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی ناپسندیدہ صفات کی مذمت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ " انسان " کا لفظ کہیں تو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ نوع انسانی کے اکثر افراد میں وہ مذموم صفات پائی جاتی ہیں، اور کہیں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مخصوص لوگوں کو تعین کے ساتھ اگر ملامت کی جائے تو ان میں ضد پیدا ہوجاتی ہے، اس لیے نصیحت کا یہ طریقہ زیادہ موثر ہوتا ہے کہ عمومی انداز میں بات کہی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰمٓ السجدہ، حاشیہ ٦٥ ، الشوریٰ ، حاشیہ ٧٥)۔

(۱۰) ۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ " کس چیز نے اسے کفر پر آمادہ کیا ؟ " یعنی بالفاظ دیگر کس بل بوتے پر یہ کفر کرتا ہے ؟ کفر سے مراد اس جگہ حق کا انکار بھی ہے، اپنے محسن کے احسانات کی ناشکری بھی، اور اپنے خالق و رازق اور مالک کے مقابلے میں باغیانہ روش بھی۔

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ۱۸؀
کس چیز سے اللہ نے اِسے پیدا کیا ہے؟

مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۱۹؀
نطفے کی ایک بوند (۱۱) سے اللہ نے اِسے پیدا کیا، پھر اِس کی تقدیر مقرر کی (۱۲)

(۱۱) ۔ یعنی پہلے تو ذرا یہ اپنی حقیقت پر غور کرے کہ کس چیز سے یہ وجود میں آیا ؟ کس جگہ اس نے پرورش پائی ؟ کس راستے سے یہ دنیا میں آیا ؟ اور کس بےبسی کی حالت سے دنیا میں اس کی زندگی کی ابتدا ہوئی ؟ اپنی اس اصل کو بھول کر یہ ہمچو ما دیگرے نیست کی غلط فہمی میں کیسے مبتلا ہوجاتا ہے اور کہاں سے اس کے دماغ میں یہ ہوا بھرتی ہے کہ اپنے خالق کے منہ آئے ؟ (یہی بات سورة یسین، آیات ۷۷ ۔ ۷۸ میں فرمائی گئی ہے)۔

(۱۲) ۔ یعنی یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں بن رہا تھا کہ اس کی تقدیر طے کردی گئی۔ اس کی جنس کیا ہوگی۔ اس کا رنگ کیا ہوگا۔ اس کا قد کتنا ہوگا۔ اس کی جسامت کیسی اور کس قدر ہوگی۔ اس کے اعضاء کس حد تک صحیح وسالم اور کس حد تک ناقص ہوں گے۔ اس کی شکل و صورت اور آواز کیسی ہوگی۔ اس کے جسم کی طاقت کتنی ہوگی۔ اس کے ذہن کی صلاحیتیں کیا ہوں گی۔ کس سر زمین، کس خاندان، کن حالات اور کس ماحول میں یہ پیدا ہوگا، پرورش اور تربیت پائے گا اور کیا بن کر اٹھے گا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں مورثی اثرات، ماحول کے اثرات اور اس کی اپنی خودی کا کیا اور کتنا اثر ہوگا۔ کیا کردار یہ دنیا کی زندگی میں ادا کرے گا، اور کتنا وقت اسے زمین پر کام کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ اس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا، نہ اس میں ذرہ برابر رد و بدل کرسکتا ہے۔ پھر کیسی عجیب ہے اس کی یہ جرات کہ جس

خالق کی بنائی ہوئی تقدیر کے آگے یہ اتنا بےبس ہے کہ اس کے مقابلہ میں کفر کرتا ہے۔

ثُمَّ السَّبِیۡلَ یَسَّرَہٗ ۙ۲۰

پھر اِس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی (۱۳)

(۱۳) یعنی دنیا میں وہ تمام اسباب و وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے، ورنہ اس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بےکار ثابت ہوتیں اگر خالق نے ان کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سرو سامان مہیا نہ کردیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کردیے ہوتے۔ مزید براں خالق نے اس کو یہ موقع بھی دے دیا کہ اپنے لیے خیر یا شر، شکر یا کفر، طاعت یا عصیان کی جو راہ بھی یہ اختیار کرنا چاہے کرسکے، اس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کردی کہ جس پر بھی یہ چلنا چاہے چلے۔

ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقۡبَرَہٗ ۙ۲۱

پھر اِسے موت دی اور قبر میں پہنچایا (۱۴)

(۱۴) یعنی اپنی پیدائش اور اپنی تقدیر کے معاملے ہی میں نہیں بلکہ اپنی موت کے معاملے میں بھی یہ اپنے خالق کے آگے بالکل بےبس ہے، نہ اپنے اختیار سے پیدا ہوسکتا ہے، نہ اپنے اختیار سے مر سکتا ہے، اور نہ اپنی موت کو ایک لمحے کے لیے بھی ٹال سکتا ہے۔ جس وقت، جہاں، جس حال میں بھی اس کی موت کا فیصلہ کردیا گیا ہے اسی وقت، اسی جگہ اور اسی حال میں یہ مر کر رہتا ہے، اور جس نوعیت کی قبر بھی اس کے لیے طے کردی گئی ہے اسی نوعیت کی قبر میں ودیعت ہوجاتا ہے، خواہ وہ زمین کا پیٹ ہو، یا سمندر کی گہرائیاں، یا آگ کا الاؤ، یا کسی درندے کا معدہ۔ انسان خود تو درکنار، ساری دنیا مل کر بھی اگر چاہے تو کسی شخص کے معاملے میں خالق کے اس فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنۡشَرَہٗ ؕ۲۲

پھر جب چاہے وہ اِسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے (۱۵)

(۱۵) یعنی اس کی یہ مجال بھی نہیں ہے کہ خالق جب اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا چاہے تو یہ اٹھنے سے انکار کرسکے۔ پہلے جب اسے پیدا کیا گیا تھا تو اس سے پوچھ کر پیدا نہیں کیا گیا تھا، اس سے رائے نہیں لی گئی تھی کہ تو پیدا ہونا چاہتا ہے یا نہیں۔ یہ انکار بھی کردیتا تو پیدا ہو کر رہتا۔ اسی طرح اب دوبارہ پیدائش بھی اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے کہ یہ مر کر اٹھنا چاہے تو اٹھے اور اٹھنے سے انکار کر دے تو نہ اٹھے۔ خالق کی مرضی کے آگے اس معاملے میں بھی یہ قطعی بےبس ہے۔ جب بھی وہ چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا اور اس کو اٹھنا ہوگا، خواہ یہ راضی ہو یا نہ ہو۔

كَلَّا لَمَّا يَقۡضِ مَاۤ اَمَرَهٗ ؕ ٢٣
ہرگز نہیں، اِس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اِسے حکم دیا تھا (۱۶)

(۱۶) یہ حکم سے مراد وہ حکم بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فطری ہدایت کی صورت میں ہر انسان کے اندر ودیعت کردیا ہے، وہ حکم بھی جس کی طرف انسان کا اپنا وجود اور زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ہر ذرہ اور قدرت الٰہی کا ہر مظہر اشارہ کر رہا ہے اور وہ حکم بھی جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے بھیجا اور ہر دور کے صالحین کے ذریعہ سے پھیلایا ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۃ دہر، حاشیہ ۵)۔ اس سلسلے بیان میں یہ بات اس معنی میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ جو حقائق اوپر کی آیتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کی بنا پر فرض تو یہ تھا کہ انسان اپنے خالق کی فرمانبرداری کرتا، مگر اس نے الٹی نافرمانی کی راہ اختیار کی اور بندہ مخلوق کا جو تقاضا تھا اسے پورا نہ کیا۔

فَلۡيَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ۙ۲۴
پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے (۱۷)

(۱۷) ۔ یعنی جس خوراک کو وہ ایک معمولی چیز سمجھتا ہے، اس پر ذرا غور کرے کہ یہ آخر پیدا کیسے ہوتی ہے۔ اگر خدا نے اس کے اسباب فراہم نہ کیے ہوتے تو کیا انسان کے بس میں یہ تھا کہ زمین پر یہ غذا وہ خود پیدا کرلیتا ؟

اَنَّا صَبَبۡنَا الۡمَآءَ صَبًّا ۙ۲۵
ہم نے خوب پانی لنڈھایا (۱۸)

(۱۸) ۔ اس سے مراد بارش ہے۔ سورج کی حرارت سے بےحد و حساب مقدار میں سمندروں سے پانی بھاپ بنا کر اٹھایا جاتا ہے، پھر اس سے کثیف بادل بنتے ہیں، پھر ہوائیں ان کو لے کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلاتی ہیں، پھر عالم بالا کی ٹھنڈک سے وہ بھاپیں از سرنو پانی کی شکل اختیار کرتی اور ہر علاقے میں ایک خاص حساب سے برستی ہیں، پھر وہ پانی براہ راست بھی زمین پر برستا ہے، زیر زمین کنوؤں اور چشموں کی شکل بھی اختیار کرتا ہے، دریاؤں اور ندی نالوں کی شکل میں بھی بہتا ہے، اور پہاڑوں پر برف کی شکل میں جم کر پھر پگھلتا ہے اور بارش کے موسم کے سوا دوسرے موسموں میں بھی دریاؤں کے اندر رواں ہوتا ہے۔ کیا یہ سارے انتظامات انسان نے خود کیے ہیں ؟ اس کا خالق اس کی رزق رسانی کے لیے یہ انتظام نہ کرتا تو کیا انسان زمین پر جی سکتا تھا ؟

ثُمَّ شَقَقۡنَا الۡاَرۡضَ شَقًّا ۙ۲۶
پھر زمین کو عجیب طرح پھاڑا (۱۹)

(۱۹) ۔ زمین کو پھاڑنے سے مراد اس کو اس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گھٹلیاں یا نباتات کی پنیریاں انسان اس کے اندر بوئے، یا جو ہواؤں اور پرندوں کے ذریعے سے، یا کسی اور طریقے سے اس کے اندر پہنچ جائیں، وہ کونپلیں نکال سکیں۔ انسان اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا کہ زمین کو کھودتا ہے یا اس میں ہل چلاتا ہے اور جو تخم خدا نے پیدا کردیے ہیں، انہیں زمین کے اندر اتار دیتا ہے، اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اسی نے بیشمار اقسام کی نباتات کے تخم پیدا کیے ہیں۔ اسی نے ان تخموں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھوٹیں اور ہر تخم سے اسی کی جنس کی نباتات اگے۔ اور اسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان تخموں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسب حال غذا بہم پنچا کر اسے نشو نما دے۔ یہ تخم ان خاصیتوں کے ساتھ، اور زمین کی یہ بالائی تہیں ان صلاحیتوں کے ساتھ خدا نے پیدا نہ کی ہوتیں تو کیا انسان کوئی غذا بھی یہاں پاسکتا تھا ؟

فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا حَبًّا ۙ۲۷

پھر اُس کے اندر اگائے غلے

وَّ عِنَبًا وَّ قَضۡبًا ۙ۲۸
اور انگور اور ترکاریاں

وَّ زَیۡتُوۡنًا وَّ نَخۡلًا ۙ۲۹
اور زیتون اور کھجوریں

وَّ حَدَآئِقَ غُلۡبًا ۙ۳۰
اور گھنے باغ

وَّ فَاکِہَۃً وَّ اَبًّا ۙ۳۱
اور طرح طرح کے پھل اور چارے

مَّتَاعًا لَّکُمۡ وَ لِاَنۡعَامِکُمۡ ؕ۳۲
تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست کے طور پر (۲۰)

(۲۰) یعنی تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ ان جانوروں کے لیے بھی جن سے تم کو گوشت، چربی، دودھ، مکھن وغیرہ سامان خوراک حاصل ہوتا ہے اور جو تمہاری معیشت کے لیے بیشمار دوسری خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اس سروسامان سے متمتع ہو اور جس خدا کے رزق پر پل رہے ہو اسی سے کفر کرو ؟

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّۃُ ۫۳۳
آخرکار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی (۲۱)

(۲۱) مراد ہے آخری نفخ صور کی قیامت خیز آواز جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی اٹھیں گے۔

یَوۡمَ یَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِیۡہِ ۙ۳۴
اُس روز آدمی اپنے بھائی

وَ اُمِّہٖ وَ اَبِیۡہِ ۙ۳۵
اور اپنی ماں اور اپنے باپ

وَ صَاحِبَتِہٖ وَ بَنِیۡہِ ؕ۳۶
اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا (۲۲)

(۲۲) ۔ اس سے ملتا جلتا مضمون سورۃ معارج آیات ۱۰ تا ۱۴ میں گزر چکا ہے۔ بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ان عزیزوں کو، جو دنیا میں اسے سب سے زیادہ پیارے تھے، مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بجائے اس کے کہ ان کی مدد کو دوڑے، الٹا ان سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے پکار نہ بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بےخوف اور آخرت سے غافل ہو کر جس طرح یہ سب ایک دوسرے کی خاطر گناہ اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اس کے برے نتائج سامنے آتے دیکھ کر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہ گاریوں کی ذمہ داری اس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے، اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدمہ کے گواہ بننے والے ہیں۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ ؕ۳۷
ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا (۲۳)

(۲۳) ۔ احادیث میں مختلف طریقوں اور سندوں سے یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " قیامت کے روز سب لوگ ننگے بچے اٹھیں گے" آپ کی ازواج مطہرات میں سے کسی نے (بروایت بعض حضرت عائشہ نے، اور برویت بعض حضرت سودہ نے اور بروایت بعض ایک خاتون نے) گھبرا کر پوچھا، یا رسول اللہ کیا ہمارے ستر اس روز سب کے سامنے کھلے ہوں گے ؟ حضور نے یہی آیت تلاوت فرما کر بتایا کہ اس روز کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا (نسائی، ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، طبرانی، ابن مردویہ، بیہقی، حاکم)۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۳۸
کچھ چہرے اُس روز دمک رہے ہوں گے

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۳۹
ہشاش بشاش اور خوش و خرم ہوں گے

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۴۰
اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اڑ رہی ہوگی

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۴۱
اور کلونس چھائی ہوئی ہوگی

أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۴۲
یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے